نیم موج: ایرانی صدر محمد خاتمی کی سوچ کیا ہے؟

فریڈ ھالیڈے*

تلخیص: محب الحق صاحبزادہ

جناب محمد خاتمی مئی ۱۹۹۷ء میں ۷۰ فیصد ووٹ لے کر ایران کے صدر منتخب ہوئے۔ اپنے انتخاب کے پہلے برس ہی جناب خاتمی نے ملک کے اندر اور بیرونی تعلقات کے ضمن میں قومی پالیسیوں کو نئی جہت پر استوار کرنا شروع کیا۔ ملک میں قانون کے لیے احترام، سیاست میں جمہوریت اور سماج میں خواتین کا کردار ان کی ترجیحات تھیں۔ باہر محض امریکہ ہی نہیں پورے مغرب سے مکالمہ ان کی خواہش ہے تاکہ برسوں پر پھیلا ہوا مخاصمانہ تناؤ کم ہو۔

کچھ معاملات ایرانی صدر کے آڑے آ سکتے ہیں۔ طاقتور قدامت پسند قوتیں ان کے اصلاحی پروگرام کے خلاف ہیں۔ تیل کی آمدن ۴۰ فیصد کم ہونے کے جو اقتصادی اثرات پڑیں گے ان کا الزام بھی جناب خاتمی پر آ جائے گا۔ نیز قریب کے خلیجی اور قزوینی (Caspian) پڑوسی ممالک اور مغرب سے کشیدگی صرف خوش نما اعلانات سے کم نہ ہوگی --- تاہم خاتمی کا آگے آنا، اور وسیع پیمانے پر دانش ورانہ اور ثقافتی جوش و خروش یہ اشارہ دے رہے ہیں کہ ایرانی سیاست میں کوئی بڑی ڈرامائی تبدیلی آنے والی ہے جس کا اثر مشرق اوسط، مغربی ایشیا اور پوری مسلم دنیا پر پڑنے والا ہے۔ خاتمی ایک نئی شخصیت اور انوکھی آواز ہے جس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

خود جناب خاتمی دینی حلقے کے قلب سے ابھرے ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں شہر یزد (Yezd) کے قریب اردکان میں پیدا ہونے والے خاتمی کے والد آیت روح اللہ خاتمی جناب آیت روح اللہ خمینی کے ساتھی اور

* Fred Halliday, "What Does Mohammad Khatmi think? Mohammad and Mill," *The New Republic*, Oct. 5, 1998 pp. 30-34

انقلاب کے بعد یزد میں امام مرحوم کے نمائندے تھے۔ خاتمی رشتے میں بھی خمینی سے منسلک ہیں۔ انقلاب کے بعد اور جناب علی اکبر رفسنجانی کے خصوصی مشیر مقرر ہونے سے پہلے ۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۲ء تک وہ ثقافت اور اسلامی رہنمائی سے متعلق وزارت کے سربراہ تھے۔ اس پوزیشن سے انہوں نے سنیما وغیرہ کے ضمن میں انقلاب کی ثقافتی سختیوں میں نرمی لانے کی کوشش کی۔

> عام دعویٰ تو یہ ہے کہ دنیا کے ہر مسئلہ کا حل اسلام کے بنیادی ماخذوں میں موجود ہے۔ لیکن خاتمی کے ہاں اس سے ہٹ کر ''تبدیلی اور سیکولر تصورات کے لیے ایک کھلا ذہن (openness) موجود ہے''۔

خاتمی کا صدر منتخب ہونا کافی اچنبھے کا باعث بنا کیونکہ خیال تھا کہ قدامت پسندوں کے امیدوار جناب ناطق نوری جیت جائیں گے۔ لیکن لگتا ہے ایرانی اکثریت نے ''تبدیلی'' کے حق میں ووٹ کا فیصلہ کیا۔

صدر خاتمی اپنے آپ کو ایک عالم کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان کے گھر میں سب سے اہم کمرہ ان کی لائبریری ہے۔ خاتمی کی فکر کو سمجھنے کے لیے ان کی دو کتابوں کا مطالعہ مفید رہے گا۔ پہلی ''بیم موج'' ہے جس میں پانچ مقالہ جات ہیں اور وہ ۱۹۹۳ء میں منصۂ شہود پر آئی۔ دوسری کتاب ''دنیائے شہر تا شہر دنیا'' (۱۹۹۴ء) ہے جس میں افلاطون سے عصر حاضر کی لبرل ازم (Liberalism) تک مغربی سیاست کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسری کتاب دراصل جمہوریت اور آزادی کے حق میں دلیل ہے اور تہذیبوں کے درمیان کھلے مکالمے کی دعوت دیتی ہے۔ کتابوں کا مرکزی خیال یہ ہے کہ مغرب اور باقی دنیا کو کلیتاً رد کرنا صحیح نہیں بلکہ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ خاتمی بھی مغرب کے ناقد ہیں لیکن عوامی جذبات سے کھیلنے کا عمومی انداز نہیں اپناتے --- ایک ثانوی ذریعہ * سے ان کے ایک قول کی تلخیص کچھ یوں ہے:

> اب جبکہ انقلاب برپا ہو چکا اور ہم اسلامی نظم کے قیام کے خواہش مند ہیں، ہمارا یہ انقلاب ایک نئی تہذیب کا ذریعہ تبھی بنے گا اگر ہم میں یہ اہلیت اور طاقت ہو کہ ہم مغربی تہذیب کی خوبیاں اخذ

*فرہنگ جہاں پور، بی بی سی مانیٹرنگ سروس

کر سکیں اور اس کے مضر پہلوؤں کی نشان دہی کر کے ان سے بچ سکیں --- اگر ایسا کرنا ہے تو مغرب کو پوری اور صحیح طرح سمجھنا ضروری ہے جبکہ بنیادی حکمت کے ذرائع اور اقدار اسلام کی عطا کردہ ہوں گی۔ اگر تم میں سے کچھ لوگ تہذیبی مسابقت اور سیاسی ٹکراؤ کا فرق ملحوظ نہیں رکھیں گے تو نیت کی درستی کے باوجود یہ اسلامی انقلاب اور قوم کی خدمت نہیں ہوگی۔ یہ وہ میدان ہے جس میں تلخ الفاظ اور دنگا فساد (violence) نہیں بلکہ فہم و ادراک، منطق اور کھلا اور منصفانہ ذہن زیادہ مؤثر رہتے ہیں۔

"بنیاد پرستی" نے صرف غیر اسلامی یا مغربی تصور ہی کو رد نہیں کیا بلکہ خود مسلم دنیا کے اندر متبادل فکر کی راہ بھی مسدود کی ہے۔ خاتمی اس کٹر، اذعانی اور راسخ فکر کے خلاف ہیں۔

عام دعویٰ تو یہ ہے کہ دنیا کے ہر مسئلہ کا حل اسلام کے بنیادی ماخذوں میں موجود ہے۔ لیکن خاتمی کے ہاں اس سے ہٹ کر "تبدیلی اور سیکولر تصورات کے لیے ایک کھلا ذہن (openness) موجود ہے"۔ اپنی صدارت کی سالگرہ پر (مئی ۱۹۹۸ء) جناب خاتمی نے "ایمان اور حریت کے ٹکراؤ" کی بات کرتے ہوئے زور دیا کہ "تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ ایسے ٹکراؤ اور مقابلہ میں جیت حریت کی ہوتی ہے۔ عقیدہ زبردستی ٹھونسنے کی دو کوششیں ہوئیں: ایک سولھویں صدی کا عیسائی نظم احتساب (inquisition) تھا، دوسرا بیسویں صدی کا کمیونزم۔ دونوں ناکام ہوئے۔ ایسی کوشش اب اسلام کے لیے ہوئی تو وہ بھی ناکام ہوگی"۔

"بنیاد پرستی" سے ہٹ کر جناب خاتمی اسلامی فکر کی ایک اور روایت سے رجوع کرتے ہیں جو انیسویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی کی ابتدائی چند دہائیوں تک قائم رہی اور جو مغرب سے اپنے رویے میں زیادہ آزاد رو اور جدت پسند تھی۔ اس فکر کے نمائندے جمال الدین افغانی، محمد عبدہ، علی عبدالرزاق، قاسم امین اور علامہ محمد اقبال تھے۔ یہ بزرگ دین اور ثقافت میں مسلمان رہنا چاہتے تھے لیکن مغرب سے سیکھنے کے خواہش مند بھی تھے۔

حالیہ برسوں میں "بنیاد پرستی" کو مسلم دنیا کی واحد آواز کے طور پر بڑی آسانی سے پیش کیا گیا ہے لیکن ایسا نہ تو ہے اور نہ ہی کبھی تھا۔ "بنیاد پرستی" نے صرف غیر اسلامی یا مغربی تصور ہی کو رد نہیں کیا بلکہ خود

مسلم دنیا کے اندر متبادل فکر کی راہ بھی مسدود کی ہے۔ خاتمی اس کٹر، اذعانی اور راسخ فکر کے خلاف ہیں۔* حافظ شیرازی سے مستعار لی ہوئی ترکیب ''بیم موج'' (fear of the storm) بہت کچھ چغلی کھا رہی ہے:

شب تاریک و بیم موج و گردابی چنیں ہایل
کجا دانند حالِ ما سبکباران ساحلہا

(گھور اندھیری رات، بیم موج اور خوفناک گرداب، ساحل سے نظارہ کرنے والے سہل پسند ہماری بری گت کو کیا سمجھ پائیں گے)

خاتمی ان بہت سے مسلم اصحاب قلم سے متفق نہیں جو کہتے ہیں کہ مغربی فکر اسلام سے ماخوذ ہے۔ وہ کسی مصنوعی تطبیق کے بھی قائل نہیں اور واضح طور پر کہتے ہیں کہ مختلف روایتوں اور تہذیبوں سے سیکھنے کا عمل جاری رہنا چاہیے۔ مغربی فکر کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں:

> ہم یہ نہ بھولیں کہ مغربی فکر حریت ذات پر استوار ہے جو ہر دور کے انسان کی مقدس دلی آرزو رہی ہے۔ از منہ وسطی سے موجودہ دور تک مغرب نے اپنے تہذیبی سفر میں بہت سے دانش ورانہ، سیاسی اور سماجی بندھنوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے اور انسانیت کو غلط کار حکمرانوں، ضابطوں اور رسوم سے آزادی دلائی ہے۔ اس نے بہت سے کالے تصورات کے تقدس کا خاتمہ کر دیا ہے جو مذہب کے نام پر انسانوں پر مسلط کیے گئے تھے۔ اور اس نے جبریت اور بے قید حکمرانی کی شان و شوکت روند کر رکھ دی ہے ---یہ سب مثبت اقدامات ہیں جو روح تخلیق سے مطابقت رکھتے ہیں--- بایں ہمہ مغرب نے انسان اور حریت کا محدود تصور اپنایا۔ یہ یک طرفہ فکر تھی جس کی انسانیت کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے---

---

* ہم فرید ہالینڈ سے کے نتائج اور رائے کی دیانتدارانہ تلخیص دے رہے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ موصوف جناب خاتمی کے اقوال کو ضرورت سے زیادہ کھینچ تان رہے ہیں۔ ایران میں حالیہ (جون، جولائی ۱۹۹۹ء) گڑبڑ کے پیچھے مغربی ہاتھ نمایاں ہے۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ ایرانی صدر بعض طلبا کی ہلاکت پر رنجیدہ ہیں وہ ''جمہوریت'' کے نام پر چلنے والی تحریک کے مضمرات سے پوری طرح باخبر بھی ہیں اور ان کا وزن مجموعی طور پر اسلامی روایت پسندوں کے حق میں ہے۔ (م-ح)

''بیم موج'' کے پہلے تین مقالہ جات میں امام روح اللہ خمینی، مرتضےٰ مطہری اور محمد باقر صدر جیسے حکماء کی کوششوں کا احاطہ کیا گیا ہے کہ وہ نئے دور کے سماجی اور سیاسی چیلنجوں کا کیا جواب دیتے ہیں۔ چوتھا مقالہ ''امید و بیم'' کے موضوع پر ہے کہ مسلمان مغرب سے اپنا تعلق اور رشتہ کیسے قائم کریں۔ پانچواں مقالہ ''ہمارا انقلاب اور اسلام کا مستقبل'' تہذیبوں کا عمومی جائزہ پیش کرتا ہے۔ خاتمی کی دلیل کے مطابق [موجودہ حالات اور بالخصوص ایران میں] اسلام کی تین جہتیں ہیں: الف- ارتجائی رجعت پسندانہ ب- التقاتی (اصطفائی*) اور ج- ناب (خالص)۔ رجعت پسند حضرات خواتین کا سیاست میں کردار تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک سیاسی اور سماجی کردار صرف علماء کا حق ہے۔ ان کی سختی یہاں تک پہنچتی ہے کہ ٹیلیویژن پر موسیقی اور کھیلوں کے پروگرام بھی برداشت نہیں کرتے۔ التقاتی دراصل مسلمان نہیں بلکہ اپنے مقاصد پر اسلام کا پردہ ڈالتے ہیں۔ (شاید) خاتمی کا یہاں اشارہ مجاہدین خلق جیسے گروہوں کی طرف ہے جو ۱۹۸۱ء سے انقلاب کے خلاف گوریلا جنگ لڑ رہے ہیں۔ جناب خاتمی کے خیال میں مغربی کفریات کا مسلمانوں میں درآنے کا سب سے خطرناک ذریعہ یہی لوگ ہیں۔

اور آخری اصل اور خالص اسلام ہے۔ اس جہت کے حق میں خاتمی اسلامی روایات کے ذرائع کو استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا ماخذ دسویں صدی کا حکیم الفارابی ہے جو مسلم اور غیر مسلم فکر کے درمیان ایک اہم رابطہ اور کڑی ہے۔ جس کا سلسلہ ماضی میں افلاطون اور ارسطو تک جاتا ہے جس کا اظہار اس کے ''المدینۃ الفاضلہ'' (Virtuous City) سے ہوتا ہے۔ جبکہ آگے کی طرف وہ اکیناس (Aquinas) اور میمونی (Maimonides) تک پہنچتا ہے۔ اپنے وقت کے علم کائنات (Cosmology) کے مطابق فارابی نے دانش و حکمت کے تین حوالوں کا ذکر کیا ہے--- حُر کی دانش، مضمر یا وجوبی دانش اور اکتسابی دانش--- ان حوالوں سے فارابی یہ بتاتا ہے کہ رضائے الٰہی اور وحی ربانی کے تابع ہو کر بھی بندہ اپنی فکر میں اور اپنے وقت کے مسائل کی تشریح اور ان کے فیصلوں میں آزاد ہے۔

آج کے دور میں حریت فکر کا یہ انداز شیعی اسلام میں نمایاں ہے۔ صرف ایران ہی میں نہیں بلکہ عراق اور لبنان میں بھی۔ خاتمی کا اس حوالہ سے عراق کے باقر صدر اور لبنان کے موسیٰ صدر کے لیے

*التقاتی / اصطفائی: دوسروں کے نظریات، تحریروں یا اسالیب میں جو سب سے اچھے نظر آئیں، ان کا انتخاب

احترام قابل ذکر ہے۔ اس نئی فکر کا مرکزی خیال ''اجتہاد'' ہے۔ سنی مسلک کے لیے تو اجتہاد کا دروازہ بڑی حد تک بند ہے لیکن انیسویں صدی میں سامنے آنے والے اصولی فرقے کے شیعہ حضرات کا معاملہ اس سے قطعی مختلف ہے۔ اصولیوں کے بانی شیخ مرتضےٰ انصاری جناب خاتمی کے لیے دوسرا منبع فیض ہیں۔ اصولیوں کا زور آزادانہ فیصلوں اور مجتہد کے اختیار (اتھارٹی) پر ہے۔ اسی تصور نے ''آیت اللہ'' کے طاقتور ادارے کو جنم دیا جس نے پہلے برطانوی اور روسی استعمار کا مقابلہ کیا اور آخر میں رضا پہلوی کی ''شاہی'' کے خلاف کامیاب تحریک برپا کی۔ یہ ''اجتہاد'' ہی تھا جس کے سہارے خمینی نے یہ دلیل دی کہ امام غائب ہے لیکن پھر بھی اسلامی حکومت کا قیام ممکن ہے۔ خاتمی اجتہاد ہی کے بل پر نئے دور کے مسائل اور غیر مسلم فکر کا جواب تلاش کرنے کی کوشش میں ہیں۔

جناب خاتمی کی فکر کا دوسرا دھارا ''تصور عرفان'' پر استوار ہے جو شیعی تصوف سے عبارت ہے۔ اس تصور کو متقدین مجتہدین نے مسترد کر دیا تھا لیکن امام خمینی اس سے بہت متاثر تھے۔ مادی عالم کے رد میں امام کے سخت گیر رویہ کی شاید یہی وجہ تھی۔ تیسری دنیا کے حوالے سے وہ کبھی آزاد صنعت کی بات بھی کر جاتے لیکن ایک بار فرمایا: ''معاشیات گدھوں کا مناسب حال مضمون ہے''۔

> موجودہ ''لبرل ازم'' کہ جسے اگر امریکی سی آئی اے سے نہیں تو مغرب پسند دانش وروں سے ضرور نسبت دی جاتی ہے، انقلابی ایران میں ایک گالی تھی۔ ایسے میں جناب خاتمی کا اس کے حق میں یہ دھیما اور ہمدردانہ نقطہ نظر کافی چونکانے والا ہے۔

صدر خاتمی اپنی ذات میں اچھے خاصے عقلیت پسند (rationalist) ہیں۔ عام ایرانی کو بھی یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ ''عرفان'' کیا ہے۔ کیونکہ شیعیت سے زیادہ اس عرفانی تصوف نے ایران کو باقی مسلم دنیا سے جدا کر رکھا ہے اور اسی سے خمینی کا قانونی (Coded) دفاع بھی ہوتا ہے۔ مثلاً خمینی کی عملی سیاست اور ثقافتی امور میں ان کے تصورات اور اقدامات کے بچاؤ کے لیے جناب خاتمی محتاط انداز میں کچھ ایسے ہی چنے ہوئے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

ماضی سے قرب و تعلق اور مغرب کے لیے کھلا ذہن خاتمی کے ہاں ساتھ ساتھ موجود ہیں جس کا وہ اکثر و بیشتر اظہار کرتے رہتے ہیں۔ عصری تشریح کے باوجود یہ ان کا ایک تاریخی تجزیہ ہے کہ مغرب اور

اسلام کا مکالمہ ضرور ہو۔ یہ ایک طرح سے تنقید ہے اس رویہ پر کہ ایران باقی دنیا سے کٹ کر کیوں رہے، مثلاً وہ فرماتے ہیں:

> حقیقی اسلامی رویہ کی ضرورت مسلّم لیکن دنیا کے موجودہ حالات میں ''استرداد'' (rejection) ایک ممکن طرز عمل نہیں۔ اخلاقی قدروں اور تصورات کی ترسیل پر سرکاری اجارہ داری نہیں ہے کہ ہم دریچے بند کر دیں اور مسائل حل ہو جائیں۔ ہم کسی کتاب کو برا سمجھ کر پابندی لگا دیں، کسی اخبار یا رسالے کو مخالفانہ رویے کی وجہ سے برداشت نہ کریں اور کسی فلم کو بننے چلنے سے روک دیں، تو کیا دوسرے غیر سرکاری ذرائع موجود نہیں جن سے وہی چیزیں لوگوں تک پہنچ جائیں؟ ایسے معاملات میں سرکاری کنٹرول کی بات نرے مذاق سے زیادہ کچھ نہیں۔

ایران کی غالب آبادی بیس برس سے کم عمر افراد پر مشتمل ہے جسے شوق ہے کہ بیرونی دنیا کو دیکھے۔ چنانچہ خاتمی کا بیان کردہ آزادی کا فلسفہ محض تصوراتی نہیں۔ خاتمی کے مخالفین ثقافتی جارحیت (cultural agression) کی بات بڑے زور شور سے کرتے ہیں اور انہوں نے ''ڈش انٹینا'' پر پابندی لگائی ہوئی ہے---لیکن وہ جسے بعض ایرانی ''خاموش جنسی انقلاب'' کہتے ہیں، سیٹلائٹ ٹیلیویژن اور صرفی اشیاء کے سنگ آگے بڑھ رہا ہے جس سے اندازہ ہو رہا ہے کہ مخالفانہ رکاوٹیں ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں۔

کشادگی (openness) کی مخالفت کو صدر خاتمی ''رجعت پسندانہ اسلام'' سمجھتے ہیں لیکن ان کی دلیل مثبت ہے کہ اسلام کو بیرونی دنیا سے رابطے سے خوف نہیں آنا چاہیے۔ ایک حرکی اور آتش بجاں اسلامی سوسائٹی کا ثقافتی رویہ تنہائی پسندی نہیں ہوسکتا۔ اس آزادروش کو جناب خاتمی اپنے ''بیم موج'' کے چوتھے مقالے میں تہذیبوں کے عمومی تصور سے مربوط کر دیتے ہیں۔ ان کے اس یک عالمی تہذیبی تصور کو، جو الگ تھلگ اور لیے دیئے تہذیبی رویوں کی نفی کرتا ہے، سیموئیل ہنٹگٹن بھی ایسے ہی رد کرے گا جیسے دوسرے مذہبی انتہا پسند، خواہ وہ مسلم ہوں، عیسائی ہوں، یہودی ہوں، ہندو ہوں یا نوکنفیوشس فکر کے حامل۔ خاتمی فرماتے ہیں:

> لینا دینا تہذیبوں کا تاریخی رویہ رہا ہے۔ کوئی تہذیب دوسری کے وجود سے بالکل نابلد نہ ہو تو وہ اس سے اثر بھی لے گی اور اسے متاثر بھی کرے گی۔

نیز یہ کہ تہذیبوں کا غلبہ ہمیشہ قائم نہیں رہتا۔ مغربی تہذیبی استیلا کو چار صدیاں ہو گئیں۔ اس سے پہلے ایسا ہی عروج اسلام کو بھی حاصل رہا۔ شاید اور حیرت انگیز طور پر، خاتمی یہ نہیں سمجھتے کہ تہذیبوں کے اتار چڑھاؤ میں کوئی فوق البشری الہامی (divine) عنصر کارفرما ہوتا ہے بلکہ ان کے بہ قول اس کے دو دنیاوی عامل ہیں: یعنی انسانی ذہن اور فطرت اور انسانی سماج کی نئی حاجات: ''ذہن انسانی جبلی طور پر مستعد رہتا اور مسلسل جوش و جذبہ کے ساتھ نئے نئے سوالات کا سامنا کرتا اور جواب تلاش کرتا ہے۔ ساتھ ہی انسان اپنی مادی ضرورتوں کی تکمیل میں جتے رہتے ہیں''۔

> خاتمی کے افکار و خیالات پر ردعمل سامنے آنے لگا ہے۔ ساٹھ ملین آبادی کے اس ملک میں عام خیال ہے کہ انقلاب کے مقاصد دوبارہ متعین ہوں اور ملکی اور خارجی حالات کے پیش نظر مختلف تصورات کو آگے آنے کا موقع دیا جائے۔

موجودہ ''لبرل ازم'' کہ جسے اگر امریکی سی آئی اے سے نہیں تو مغرب پسند دانش وروں سے ضرور نسبت دی جاتی ہے، انقلابی ایران میں ایک گالی تھی۔ ایسے میں جناب خاتمی کا اس کے حق میں یہ دھیما اور ہمدردانہ نقطہ نظر کافی چونکانے والا ہے۔ صدر خاتمی کو شکایت ہے کہ ایرانی اصحاب علم کو مناسب اطلاعات سے محروم رکھا گیا ہے ورنہ ان کا نتیجۂ فکر زیادہ وقیع اور معتبر ہوتا۔ کبھی تو جناب خاتمی بھی تیسری دنیا کے عمومی انداز میں پورے مغرب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں جہاں سے آزادروی، سرمایہ داری اور امپیریلزم نے جنم لیا۔ لیکن بالآخر ''از دنیائے شہر ...'' میں وہ اقرار کرتے ہیں کہ جن قدروں کو وہ پسند کرتے ہیں وہ کسی ایک جسم واحد (unitary) مغرب کا تحفہ نہیں بلکہ خود مغرب کے اندر برپا کشمکش کے نتائج ہیں۔ اور وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ ان قدروں کے لیے مغرب نے بڑی بھارتی قیمت روایتی فکر اور اداروں کی قربانی کی شکل میں دی۔

خاتمی کی سوچ کا عملی زندگی اور سیاست پر جو اثر پڑ سکتا ہے اس کا بہت کچھ اظہار ان کی کتابوں اور تقریروں سے ہوتا ہے۔ وہ وقت کی تہذیبی ضرورتوں اور فلسفیانہ نظام کی ضرورت پر زور دیتے رہتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں اس ضرورت کا اچھا خاصا عکس موجود ہے۔ تین امور پر ان کا خصوصی زور ہے: اولاً وہ سیاسی آزادی کے حامی ہیں اور چاہتے ہیں کہ سیاسی پارٹیوں کو کھلا کام کرنے کی اجازت ہو نیز پریس

بندشوں سے آزاد ہو ثانیاً، وہ قانون کی بالادستی اور آئینی اور دستوری حکومت چاہتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ بیسویں صدی میں ایران میں پہلا انقلابی عمل ۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۱ء کی دستوری کشمکش سے عبارت تھا اور کہ آج دستور کی موجودگی ہی ملک میں جمہوریت کی ضمانت مہیا کر رہی ہے۔ ثالثاً، وہ ایک ''مہذب شہری سماج'' (civil society) کی وکالت کرتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آزاد سماجی ادارے عوامی زندگی میں کارفرما موجود ہوں۔ زیادہ واضح طور پر اس کا مفہوم یہ بنا کہ سیاست میں لوگوں کی مستعد شرکت یقینی ہو اور حکومت عوامی رائے کی محکوم ہو۔ اپنے ۴ اگست ۱۹۹۷ء کے افتتاحی خطاب میں جناب خاتمی نے ان عمومی تصورات کا تفصیلی خاکہ پیش کیا۔ صدر مملکت کے فرائض ان کے خیال میں اس کو مستلزم ہیں کہ وہ دین مملکت کی حفاظت کرے، لوگوں کی خدمت بجالائے، بے غش حکمرانی سے اجتناب کرے، اور فرد اور قوم کے حقوق، استقلال اور احترام کا امین ہو۔ انہوں نے حضرت سیدنا علیؓ کے الفاظ میں کہا:

> میری تعریف مت کرو تاکہ میں نایافت حقوق اور فرائض ادا کرسکوں۔ مجھے ایسے خطاب مت کرو جیسے جباروں کو خطاب کیا جاتا ہے، اور مجھ سے منہ مت پھیرو جیسے مغضوب الغضب افراد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ میرے ساتھ تصنع مت برتو۔ کبھی مت سوچو کہ سچ مجھے برا لگتا ہے۔ میری شان زیادہ مت بڑھاؤ۔ جسے شکایت سننا بار لگے اس کے لیے عدل کرنا مشکل تر ہوگا، لہٰذا میرے سامنے سچ کے اظہار اور امور عدل کے بیان میں کبھی نہ ہچکچاؤ۔ نہ میں لافانی ہوں اور نہ اپنے اعمال میں خطا سے مبرا، الا کہ اللہ تعالیٰ نفس کے مقابلہ میں میری حفاظت فرمائے کہ وہ میرے نفس پر مجھ سے زیادہ قادر ہے۔

اپنے اسی افتتاحی خطاب میں خاتمی نے عدلیہ اور انتظامیہ سے اپیل کی کہ وہ معاشرے میں قانون کی حکمرانی قائم کریں۔ بالخصوص عدلیہ عمل احتساب کو تقویت دے۔ خاتمی کے خطاب میں بندگی و عبادت کا ذکر کم تھا۔ لیکن زیادہ زور اس پر تھا کہ لوگوں کے حقوق ادا ہوں اور انہیں امور مملکت میں ساجھی بنایا جائے۔ بین الاقوامی امور میں خاتمی کی خواہش تھی کہ ایران ایک ''فاخر (proud)، خوشحال اور آزاد'' مملکت ہو جو تہذیبوں میں مکالمے کی حمایت کرے۔

خاتمی کے افکار و خیالات پر ردعمل سامنے آنے لگا ہے۔ ساٹھ ملین آبادی کے اس ملک میں عام

خیال ہے کہ انقلاب کے مقاصد دوبارہ متعین ہوں اور ملکی اور خارجی حالات کے پیش نظر مختلف تصورات کو آگے آنے کا موقع دیا جائے۔ صدر خاتمی کا لہجہ اور طرز عمل بھی بہت مؤثر ہے۔ وہ نہ کسی کو برا کہتے ہیں نہ لتاڑتے ہیں، بس ایک دھیما اور معقول انداز بیاں ہے۔ ان کی سادگی ـــــ کہ وہ پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرتے اور کسی شان وشوکت اور ہٹو بچو کے بغیر آتے جاتے رہتے ـــــ نے ایرانیوں کی اکثریت کو متاثر کیا ہے۔

ایسا بھی نہیں کہ سبھی ایرانی ان سے راضی ہوں۔ قدامت پسند انہیں ناکام کرنے کے سارے حربے استعمال کر رہے ہیں، اور جناب علی خامنائی کی شکل میں ان کا اصل حریف ان لوگوں کے سامنے ہے۔ دوسری طرف لادین طبقہ ہے جو حلقۂ علما سے ابھرنے والے اور اسی حلقہ میں خوش رہنے والے شخص یعنی صدر خاتمی کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ خاتمی ان دو متضاد قسم کے مخالفین کا مقابلہ کیسے کرتے ہیں۔ اس معاملے میں رجائیت اور مایوسی دونوں گمراہ کن ہوسکتی ہیں۔ بعض معاملات میں خاتمی گورباچوف جیسے ہیں جو کچھ ارادے لے کر آیا تھا لیکن بالکل بے اختیار تھا۔ یاد رہے کہ گورباچوف کو دو سال تو اپنی سنٹرل کمیٹی کی تشکیل میں لگے تھے۔ لیکن گورباچوف سے خاتمی کی مشابہت کی ایک حد ہے۔ وہ یوں کہ ایک لحاظ سے خاتمی اس آخری سوویٹ لیڈر سے بھی زیادہ کمزور ہیں کہ ایران میں قوت کے کئی مراکز ہیں۔ لیکن وہ گورباچوف سے زیادہ مضبوط بھی ہیں کہ انہیں عوامی انتخابی تائید حاصل ہے، کوئی ایسا خارجی معاملہ نہیں جس پر انہیں نئے سرے سے مذاکرات کرنے ہوں اور ان کی پشت پر ایک ایسا دستور ہے کہ مناسب اصلاحات کے بعد وہ اس ایران کی تعمیر کر سکتے ہیں جو ان کا خواب ہے---آنے والے چند برس بتادیں گے کہ اس خواب کی تعبیر کیا بنتی ہے۔

[فریڈ ہالیڈے لندن سکول آف اکنامکس میں "بین الاقوامی تعلقات" کے پروفیسر ہیں۔ مدیر]